بیادگار: حکیم محمد یوسف حسن

JANUARY 2023

جنوری 2023ء

سرپرست: انجینئر حسین طارق

ماہنامہ

نیرنگِ خیال

راولپنڈی

جلد 98 شمارہ 1

مدیر اعلیٰ
سلطان رشک

مدیر معاون
فیصل سلطان
سعد سلطان

قیمت 125 روپے

زرِ سالانہ 1500 روپے
بیرونی ممالک: 35 پونڈ ...... 70 ڈالر
قائم شدہ: 1924ء لاہور

ناشر: سلطان رشک مطبع: ایس ٹی پرنٹرز، گوالمنڈی راولپنڈی

موبائل
0333-5692523

پتہ: G-221 نزد پی ایم اے ہاؤس، لیاقت روڈ، راولپنڈی
ای میل monthlynerangekhayal@gmail.com

ڈاکٹر غلام شبیر رانا

عثمانہ اختر جمال: لکھنوی تہذیب کی پارس اور پارکھ

حال ہی میں مجھے ڈاک کے ذریعے محترمہ عثمانہ اختر جمال کی تصنیف ''لکھنؤ کی تہذیب'' موصول ہوئی ہے۔ یہ کتاب جسے فضلی بک، کراچی نے نومبر 2022ء میں شائع کیا ہے ایک ایسا جام جہاں نما ہے جس میں پوری دنیا کی تہذیبی اقدار کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ امریکہ میں مقیم ممتاز بھارتی ادیبہ محترمہ عثمانہ اختر جمال دنیا بھر کی خواتین کو ولولۂ تازہ عطا کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آتی ہیں۔ لکھنؤ کے شہر نگاراں کے زندہ دِل، شگفتہ مزاج، مخلص، باوفا اور ہمدرد لوگوں کی تہذیب کی امین محترمہ عثمانہ اختر جمال نے اپنی اس تصنیف کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ نوابوں کا شہر ہے، یہ مسکرانے کا شہر ہے۔ یہ میر تقی میر کا شہر ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ میرا شہر ہے۔ جب تک میں لکھنؤ سے باہر نہیں نکلی تھی مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ لکھنؤ کے پاس تہذیب کا اتنا بڑا خزانہ ہے۔ اس خزانے کی اتنی شہرت ہے سنی ہوئی باتوں کے ساتھ اپنی خود دیکھی ہوئی باتیں اور واقعات یاد آنے لگے۔''

اپنی یادداشتوں کو سمیٹتے ہوئے محترمہ عثمانہ اختر جمال نے اِس کتاب میں یہی پیغام دیا ہے کہ ہجومِ غم میں بھی دِل کو سنبھالتے ہوئے مسکرایئے کہ آپ لکھنؤ کی تہذیب کے بارے میں پڑھ رہے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے موجودہ دور میں نشر و اشاعت اور اظہار و ابلاغ کے شعبوں میں انقلاب برپا ہو چکا ہے۔ فیس بک، یوٹیوب، برقی کتب، ای میل، ڈائجسٹ، علمی و ادبی ویب سائٹس اور اخبارات و جرائد نے افکارِ تازہ کے وسیلے سے جہانِ تازہ تک رسائی کے متعدد نئے امکانات تک رسائی آسان بنا دی ہے۔ محترمہ عثمانہ اختر جمال نے جدید دور کے اِن تمام ذرائع ابلاغ سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اُن کی تخلیقی تحریریں برصغیر کے جن ممتاز ادبی مجلّات کی زینت بنیں اُن میں الاقربا، اسلام آباد (پاکستان)، تریاق ممبئی، تمثیل نو کلکتہ، دیدہ ور، بوسٹن۔ امریکہ، خرمن: پاکستان، بھارت، پاکیزہ آنچل دہلی، مشرقی دلھن دہلی، لاریب لکھنؤ، بیسویں صدی دہلی، شعر و سخن کینیڈا، اُردو لنک امریکہ اور ہفت روزہ گواہ (حیدر آباد، بھارت) شامل ہیں۔ کشمکشِ دہر سے آشنا لوگ جانتے ہیں کہ سیلابِ حیات کا بلا خیز طوفان نہایت سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ اس کے مہیب گرداب میں آلامِ روزگار کے پاٹوں میں پسنے والے سوزِ غم سے نڈھال مظلوم اور قسمت سے محروم انسان خس و خاشاک کے مانند بہتے چلے جا رہے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ اس آشوب میں کوئی بھی دُکھی انسانیت کا پرسان حال نہیں۔ آفتاب، مہتاب، کہکشاں، بیاباں میں کھلنے اور بکھرنے والے گل ہائے رنگ رنگ کا قدر شناس کون ہوگا؟ ہوس نے جہاں نوع انسان کو انتشار اور زبوں حالی کی بھینٹ چڑھایا وہاں اس کے تباہ کن اثرات سے نئی نسل بے حسی کا شکار ہو گئی اور قلب و روح بالکل مردہ ہو چکی ہے۔ محترمہ عثمانہ اختر جمال نے اپنی اس کتاب میں واضح کیا ہے کہ اس خطے میں تہذیبی نمو کا سلسلہ سمے کے سم کے ثمر سے متاثر نہ ہوا۔ اپنی جنم بھومی لکھنؤ کے حوالے سے اُن کے اسلوب میں متعدد آفاقی صداقتوں کا پرتو ملتا ہے۔ زندگی میں نئے مفاہیم کی جستجو اس سلسلے میں قابل ذکر ہے۔ خاکِ وطن سے قلبی وابستگی اور والہانہ محبت ان کے اسلوب کو روح اور قلب کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتر جانے والی اثر آفرینی سے متمتع کرتا ہے۔ اپنی جنم بھومی سے دُوری کا احساس اُن کی تحریروں کا نمایاں وصف ہے۔ جس خلوص اور دردمندی سے انھوں نے لکھنؤ کی یادوں اور تہذیبی اقدار کو زیبِ قرطاس کیا ہے وہ اُن کی انفرادیت کی دلیل ہے۔ وطن سے دُوری ایک مجبوری بن جائے تو انسان کو جس کرب سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ ایک صبر آزما مرحلہ ہے۔ محترمہ شبنم شکیل نے دِل پر گزرنے والے موسموں کے حوالے سے سچ کہا تھا:

جو بیتی ہے وہ دہرانے میں کچھ وقت لگے گا — اس غم کو اک یاد بنانے میں کچھ وقت لگے گا
یہ مت سمجھو دنیا والو تھک کر بیٹھ گئے ہم — پچھلی چوٹوں کو سہلانے میں کچھ وقت لگے گا (شبنم شکیل)

پس نو آبادیاتی دور میں اس خطے میں تانیثیت پر مبنی تنقیدی اندازِ فکر نے اپنی اہمیت، افادیت اور مقبولیت کا لوہا منوایا ہے۔ محترمہ عثمانہ اختر جمال نے ادب اور فنون لطیفہ میں اپنی صلاحیتوں کی دھاک بٹھا دی ہے۔ فطرت اور ماحول سے خواتین کی یگانگت اور گہرا ارتباط ان کی تحریروں کا امتیازی وصف ہے۔ اِسی کے معجز نما اثر سے جہد للبقا کے موجودہ زمانے میں اُن کی تخلیقی تحریریں خود اپنا اثبات ہیں۔ موجودہ زمانے میں عالمی ادب

میں نفسیاتی حوالے سے عورت، جنس اور جذبات کو نمایاں حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ ارضی، ثقافتی اور تہذیبی حوالے سے محترمہ عثمانہ اختر جمال کی تحریریں خلوص اور دردمندی کی مظہر ہیں۔ محترمہ عثمانہ اختر جمال کے اسلوب میں جس انداز میں بے لوث محبت کے جذبات سرایت کر چکے ہیں وہ ان کی تخلیقی تحریروں میں نمایاں ہیں۔ تانیثیت پر مبنی تخلیقی تحریروں میں جہاں حیاتیاتی تناظر میں بات کی جاتی ہے وہاں تہذیبی، ثقافتی اور عمرانی مسائل کے تنوع پر بھی اُن کی توجہ مرکوز رہتی ہے۔ عالمی کلاسیک کا جائزہ لینے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ بعض ناقدین حسن صورت کو تخیل کا منبع قرار دیتے ہیں مگر محترمہ عثمانہ اختر جمال کے اسلوب کے سوتے مٹی کی محبت سے پھوٹتے ہیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ انسانیت، وطن اور اہلِ وطن کے لیے ایثار، وفا، محبت اور ہجر و فراق کے موضوعات پر اُن کا انداز دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور سنگلاخ چٹانوں، جامد و ساکت پتھروں اور بے حِس مجسموں سے بھی اپنی تاثیر کا لوہا منوا لیتا ہے۔ اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ تہذیبی ارتقا ایک واضح صداقت کا نام ہے جس میں سے رنگ، خوشبو، حسن و جمال، راحت و مسرت اور آسودگی کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ اسے ایک خاص طبقے یا صنف کی تخلیقات کا مخزن قرار دینا درست نہ ہوگا۔ تاریخ کے پیہم رواں عمل کو ذہن میں رکھتے ہوئے حیاتیاتی عوامل کی بنا پر کسی بھی خطے کی تہذیب کو مستقل نوعیت کی اہمیت ملنی چاہیے۔ تہذیبی اقدار سے متعلق یادیں لمحات کے بجائے صدیوں کے سفر کی علامت ہیں۔ لکھنؤ کی تہذیب پر لکھی گئی یہ تصنیف اپنے دامن میں متعدد تاریخی صداقتیں لیے ہوئے ہے۔ لکھنؤ کے ہمالہ کی سر بہ فلک چوٹیوں میں آصف الدولہ، خواجہ حیدر علی آتش، میر حسن، میر انیس، میر خلیق، مرزا سلامت علی دبیر، میر تقی میر، غلام ہمدانی مصحفی، محمد رفیع سودا، عبدالحلیم شرر، محسن کاکوروی، رجب علی بیگ سرور، امیر مینائی، اسرار الحق مجاز، سیّد فضل الحسن حسرت موہانی، امام بخش ناسخ، عرفان صدیقی، قلندر بخش جرأت، شوق لکھنوی، منشی سجاد حسین، مصطفیٰ خان یک رنگ، پنڈت دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، مرزا واجد حسین یاس یگانہ چنگیزی، امانت لکھنوی، آنند نرائن ملا، عزیز بانو داراب وفا، بہزاد لکھنوی، مرزا ہادی رسوا، منشی نول کشور، نوشاد علی اور واجد علی شاہ اختر شامل ہیں۔ تاریخ کے ہر دور میں اردو زبان و ادب کے قارئین لکھنوی تہذیب کے ان معماروں کے سامنے کلاہ کج کرتے رہیں گے۔

سیلِ زماں کے تھپیڑے تخت و کلاہ و تاج کے سب سلسلوں کو نیست و نابود کر دیتے ہیں مگر تہذیب جو اندیشۂ زوال سے نا آشنا ہے، ہمیشہ محفوظ رہتی ہے۔ محترمہ عثمانہ اختر جمال نے اپنی تخلیقی تحریروں کے وسیلے سے لکھنؤ کی صدیوں پرانی تہذیبی میراث کو نئی نسل تک منتقل کرنے کے سلسلے میں جس فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے وہ اُن کی فہم و فراست، تاریخ سے دلچسپی، دیانت، ادبی لگن اور خلوص کا ابد آشنا نمونہ ہے۔ لکھنوی تہذیب کی عکاس یہ تصنیف اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک خاص بود و باش رکھنے والی اور منفرد طرز معاشرت کی حامل ایک فطین ادیبہ سے منسوب ہے، جہاں کی ہر ادا جہان دیگر کی مظہر ہے۔ آسماں در آسماں اسرار کی پرتوں میں پنہاں نظام ہستی کی تفہیم پر توجہ دے کر محترمہ عثمانہ اختر جمال نے ''لکھنؤ کی تہذیب'' لکھ کر لکھنوی معاشرے میں زیست کی توانائی کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ فہمیدہ ریاض نے اپنی آزاد نظم ''زادِ راہ'' میں جو سوال کیا ہے وہ تہذیبی استحکام کے سلسلے میں ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے:

طویل رات نے آنکھوں کو کر دیا بے نور — کبھی کو عکس سحر تھا، سراب نکلا ہے
سمجھتے آئے تھے جس کو نشان منزل کا — فریب خوردہ نگاہوں کا خواب نکلا ہے
تھکن سے چور ہیں، آگے بڑھیں کہ لوٹ آئیں

اپنی تحریروں میں محترمہ عثمانہ اختر جمال نے ہمیشہ حریت فکر کا علم بلند رکھا ہے۔ نو آبادیاتی دور میں ادب میں سب سے زیادہ نقصان وہ بات یہ رہی ہے کہ قارئین کی سوچ معطل اور ارادے تحلیل کرنے کی کوشش کی گئی۔ امرتسر کا قصاب (ڈائر) اور اس کے آقا یہ چاہتے تھے کہ اِس خطے میں شعری اور ادبی پذیرائی کم ہو جائے اور استعماری نظام کے پروردہ نام نہاد دانش ور اور بغل بچہ قماش کے نقاد اپنے شخصی وجود کو منوانے پر زور دینے لگیں۔ نسائی لب و لہجے اپناتے ہوئے نسل نو کو تعلیم و تربیت کے ذریعے تہذیبی و ثقافتی میراث کی منتقلی محترمہ عثمانہ اختر جمال کا ایسا فقید المثال کارنامہ ہے جس کے اعتراف میں ہر عہد کے باشعور قارئین کی گردن خم رہے گی۔ اس سلسلے میں انھوں نے جس وسعتِ نظر کے ساتھ لکھنؤ کے بام و در اور اس کے مکینوں کے رہن سہن کی لفظی مرقع نگاری کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انھیں اس بات کا شدت سے احساس رہا ہے کہ تہذیبی و ثقافتی اقدار و روایات کی نمو وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ اس میں کسی کوتاہی کا ارتکاب ایک مہلک غلطی ہے جو پورے معاشرے کو بے حسی کی بھینٹ چڑھا سکتی ہے۔ نو آبادیاتی دور میں اردو ادب میں تہذیبی ارتقا پر بالعموم مناسب توجہ نہیں دی گئی۔ محترمہ عثمانہ اختر جمال نے اپنی اس تحقیقی تصنیف ''لکھنؤ کی تہذیب'' میں قلزم ہستی میں معاشرتی زندگی کے بارے میں اُٹھنے والی لہروں کی جانب متوجہ کیا ہے۔ انھوں نے بے حسی کے مسلط کردہ سکوت اور بے عملی پر کاری ضرب لگائی ہے۔ اُن کی نگاہیں اس خطے کے ماضی، حال اور مستقبل پر مرکوز ہیں۔ لکھنؤ کی تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے معاشرتی زندگی میں انسانی مساوات، عدل و انصاف اور سلطانی

جمہور کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ہر عہد کے لوگوں کے لیے نشانِ منزل ثابت ہوگا۔ انھوں نے اپنی جنم بھومی کے بارے میں شعور و آگہی کی جو مشعل فروزاں کی ہے اُس کے معجز نما اثر سے سفاک ظلمتیں کافور ہوں گی اور حوصلے کو نئی جہت نصیب ہوگی۔

برصغیر کی خواتین نے ہر دور میں تاریخی آگہی (Historical Awareness) اور عصری آگہی پر توجہ مرکوز رکھی ہے۔ ان کے ہاں معروضیت (Objectivity) کا عنصر نمایاں رہا ہے۔ اُن کی تخلیقی تحریروں میں مابعد جدیدیت کی ایک پیچیدہ (Complex) صورت حال واضح دکھائی دیتی ہے۔ نوآبادیاتی دور کے خاتمے کے بعد جب اس خطے میں سلطانیٔ جمہور کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا تو مٹی کی محبت کا جذبہ زیادہ جوش اور ولولے کے ساتھ اُبھرا۔ پس نوآبادیاتی دور میں اِس خطے کی خواتین نے اپنے قول و فعل سے یہ ثابت کر دیا کہ ان اقدار و روایات کو پروان چڑھانا چاہیے جن کے اعجاز سے تہذیبی تحفظ اور معاشرتی زندگی میں خیر و فلاح کے امکانات کو یقینی بنایا جا سکے۔ محترمہ عثمانہ اختر جمال نے مقدور بھر کوشش کی کہ ہر مصلحت سے بالاتر رہتے ہوئے حق گوئی و بے باکی کو شعار بنایا جائے اور اخلاقیات کے ارفع معیار تک رسائی پر توجہ دی جائے۔ انفرادی اور اجتماعی لاشعور کی جو کیفیت محترمہ عثمانہ اختر جمال کی تخلیقات میں جلوہ گر ہے اس کا تعلق دروں بینی سے ہے۔ انھوں نے حیاتِ مستعار کے حبس زدہ زندان میں سانس گن گن کر زندگی کے دِن پورے کرنے والی غریب عورتوں کی حالتِ زار پر چشم کشا حقائق سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ شاعری اور افسانہ نگاری کے فن میں اُن کے اسلوب کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ انھوں نے کٹھن حالات میں بھی شمع وفا کو فروزاں رکھا ہے اور مظلوم، محروم اور مجبور عوام سے جو عہدِ وفا کیا اسے ہر حال میں استوار رکھنے کی سعی کی۔ معاصر اردو ادب میں جن خواتین نے تہذیبی ترفع کی خاطر پرورشِ لوح و قلم میں گہری دلچسپی لی اُن میں الطاف فاطمہ، افضل توصیف، امرتا پریتم، ادا جعفری، انیس بانو، بانو قدسیہ، باراں فاروقی، بسمل صابری، پروین شاکر، پروین فنا سیّد، بلقیس ظفیر الحسن، پروین ملک، پروین شاکر، جہاں آرا حبیب اللہ، جمیلہ ہاشمی، حمیدہ اختر حسین رائے پوری، خالدہ حسین، خدیجہ مستور، ذکیہ بدر، رضیہ بٹ، رضیہ فصیح احمد، زاہدہ حنا، زہرہ نگاہ، سارا شگفتہ، سلمیٰ صدیقی، صالحہ عابد حسین، صفیہ اختر، صدیقہ بیگم، عصمت چغتائی، عذرا پروین، عثمانہ اختر جمال، فاطمہ حسن، فرخ زہرا گیلانی، فرزانہ اعجاز، فہمیدہ ریاض، قرۃ العین حیدر، کشور ناہید، گلنار آفریں، مخفی لکھنوی، ممتاز شیریں اور ہاجرہ مسرور کے نام کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ محترمہ عثمانہ اختر جمال نے اپنی تخلیقی فعالیت سے اسی درخشاں روایت کو پروان چڑھانے کی کوشش کی ہے جس کے نقوش ان منفرد اسلوب کی حامل خواتین کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ تہذیبی بقا کی خاطر جدوجہد کرنے کے سلسلے میں ہر عہد کے ادب میں ان یگانۂ روزگار خواتین کے اسلوب کے اثرات موجود ہیں گے اور تاریخ ہر دور میں ان کے نام کی تعظیم کرے گی۔ آج ہمیں ہوا کی دستک کو سن لینا چاہیے کہ آنے والی رت بہت کڑی ہے۔ تہذیبی تحفظ کو یقینی بنانے کی خاطر اور حصارِ جبر کی اندھی فصیل کو منہدم کرنے کے لیے کوبہ کو بیداری کا پیغام پہنچانا ہوگا۔ بے چہرہ لوگوں اور بے در گھروں میں حوصلے اور امید کی شمع فروزاں کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ امن عالم اور تہذیبی تحفظ کے لیے خواتین میں احساسِ ذمہ داری اور بیداری کی جو لہر پیدا ہو گئی ہے وہ ہر اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔ محترمہ عثمانہ اختر جمال کی تمنا ہے کہ اہلِ لکھنو کو جہادِ زندگانی میں اُن کے آبا کی ستیز سے آگاہ کیا جائے تاکہ معاشرتی زندگی میں عیش و عشرت سے نمو پانے والے جمود و سکوت کے عفریت کا خاتمہ کیا جائے۔

محترمہ عثمانہ اختر جمال نے لکھنؤ کی سرزمین کو تہذیب کے ایسے معدن سے تعبیر کیا ہے جہاں سے تاریخ کے ہر دور میں نادر ہیرے جواہرات نکلے ہیں۔ اپنی اس تصنیف میں انھوں نے لکھنؤ کی تہذیب کی نسل در نسل منتقلی کے صدیوں پر محیط عمل پر تحقیقی نگاہ ڈالی ہے۔ اس تصنیف میں لکھنؤ کی زندگی کا جو منظم، مربوط اور دلچسپ احوال لکھا گیا ہے اُس سے علم و ادب کی ثروت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔

محترمہ عثمانہ اختر جمال کی تصانیف: رعنائیاں درد کی (شاعری) عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، تتلیوں کے رنگ (افسانوی مجموعہ)، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، تین گلاب (افسانوی مجموعہ) فضلی بک کراچی، پاکستان۔

افسانوی مجموعے: عظمت کا ستون، سسکیوں کی آواز، زخم جدائی، دِل کی معصوم صدا، ونتی (ہندی)، چاندنی کا تحفہ (ہندی) زیرِ طبع ہیں۔ شعری مجموعہ اُجالوں کی رہ گزر اُردو اور ہندی میں جلد شائع ہوگا۔

ماہرین عمرانیات کا خیال ہے کہ لکھنؤ کے باشندے بہت مہذب ہیں اور وہاں کسی قسم کی عصبیت موجود نہیں۔ ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ وہاں امن کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کی عظیم تقریب عید میلاد النبی ﷺ کے بارے میں محترمہ عثمانہ اختر جمال نے لکھا ہے:

"ربیع الاول کے مہینے میں گھر گھر سے مجلس کی آوازیں آتی تھیں اور پورے مہینے یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ بارہ ربیع الاوّل کو گھر گھر اور پورے شہر میں روشنی ہوتی تھی۔۔۔ گیارہ ربیع الاوّل کو پوری رات مشاعرہ ہوتا تھا۔ جس میں پوری دنیا کے شاعر مدعو کیے جاتے

تھے اور مشاعرہ سننے والوں میں ہر مذہب کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ سُنا ہے کہ جگر مرادآبادی نے اپنی مشہور نعت ''ایک رِند ہے اور مدحتِ سلطانِ مدینہ'' لکھنؤ کے اِس مشاعرے میں رو رو کر پڑھی تھی اور پُوری پبلک کو رُلا دیا تھا۔'' (عثمانہ اختر جمال: لکھنؤ کی تہذیب، صفحہ 25)

اِک رِند ہے اور مدحت سلطانِ مدینہ — ہاں کوئی نظر رحمتِ سلطانِ مدینہ
اے خاکِ مدینہ تری گلیوں کے تصدق — تو خلد ہے تو جنتِ سلطانِ مدینہ

جدید دور میں معاشرے کی حیات آفریں اقدار کا ذکر کرتے ہوئے مصنفہ نے حرفِ صداقت سے قلبی وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ اپنے بارے میں تمام حقائق بیان کر کے انھوں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ حالات اور واقعات کی لفظی مرقع نگاری کرتے وقت اپنی ذات کا احتساب از بس ضروری ہے۔ تاریخ اور تہذیب کے موضوع پر لکھتے وقت انھوں نے ماضی کے واقعات پر پڑی ابلقِ ایام کے سُموں کی گرد کو صاف کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ شہروں کی تہذیب کے موضوع پر لکھنا بڑی احتیاط کا متقاضی ہے۔ یہاں تحریر اور تحریرِ نو کا ایک غیر مختتم سلسلہ جاری رہتا ہے جو فعالیتیں آج مقبول ہیں ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں لوگ انھیں نظر انداز کر دیں۔ وہ ماضی کے عظیم واقعات سے مواد اور مآخذ کو تلاش کرتی ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ معاشرتی زندگی کے معمولات کو ایک ایسے ضابطے کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے جو افراد کی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے مصنفہ نے یہاں کی مذہبی رواداری کا حوالہ دیا ہے۔ لکھنؤ کے محرم کے بارے میں محترمہ عثمانہ اختر جمال نے بہت عمدہ پیرائے میں حقائق زیبِ قرطاس کیے ہیں۔ انھوں نے کربلا کے شہیدوں کی عظیم قربانی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''محرم کے غم میں ڈُوبے ہوئے دس دِن لکھنؤ کی تہذیب کا بہت اعلیٰ نمونہ تھے۔ سب ہندو، مسلم، سکھ عیسائی تعزیے رکھتے تھے۔ .....خوب صورت، عالی شان اِمام باڑوں میں روشنی ہوتی تھی۔ سڑکوں پر جاڑوں میں چائے کی اور گرمی میں شربت کی سبیلیں لگتی تھیں۔ لکھنؤ کا محرم اپنے غم اور اپنے وقار کے لیے پوری دنیا میں مشہور ہے۔'' (عثمانہ اختر جمال: لکھنؤ کی تہذیب، صفحہ 24)

لکھنؤ میں ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا عشرہ محرم میں نواسۂ رسول ﷺ کی شہادت پر مجالس میں شرکت کرنا اس شہر کو ممتاز حیثیت عطا کرتا ہے۔ لکھنؤ میں عاشورہ محرم کے بارے میں محترمہ عثمانہ اختر جمال نے لکھا ہے:

''محرم کے غم میں ڈُوبے دس دِن لکھنؤ کی تہذیب کا بہت اعلیٰ نمونہ تھے۔ سب ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی تعزیے رکھتے تھے۔ رام سوا رُوپ کا تعزیہ باجوں کے ساتھ اُٹھتا تھا۔ رام سوا رُوپ ہندو تھے۔ اُن کو حضرت اِمام حسینؑ سے بہت عقیدت تھی اس لیے وہ تعزیہ رکھتے تھے۔ اُن کے گھر کا تعزیہ غمگین دُھن بجاتے ہوئے باجوں کے ساتھ اُٹھتا تھا۔ دس دِن تک اُن کا غم میں ڈُوبا باجا بجتا رہتا تھا۔'' (عثمانہ اختر جمال: لکھنؤ کی تہذیب، صفحہ 24)

کوفہ اور شام کی سفاک سپاہ کے جبر اور شقاوت آمیز ناانصافیوں کے احوال کے نتیجے میں اُن کا نام و نشاں تاریخ کے طوماروں میں دب گیا مگر کاروانِ حسینؑ آج بھی روشنی کا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ جوش ملیح آبادی نے شہیدِ کربلا حضرت امام حسینؑ کے حضور اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے اپنی ایک رباعی میں کہا تھا:

کیا صرف مسلمان کے پیارے ہیں حسینؑ — چرخِ نوعِ بشر کے تارے ہیں حسینؑ
انسان کو بیدار تو ہو لینے دو — ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

اس کتاب میں محترمہ عثمانہ اختر جمال نے حریتِ فکر و عمل پر انحصار کرتے ہوئے مدلل انداز میں یہ واضح کیا ہے کہ لکھنؤ کے باشندوں نے اپنی فہم و فراست اور تدبر و بصیرت سے کام لیتے ہوئے اقتضائے وقت کے مطابق تاریخ کے ہر دور میں عصری چیلنجز کا پوری قوت سے جواب دیا۔ انھیں اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ تہذیب کے متعلق حقائق کو جمع کرنا تاریخی اہمیت و افادیت سے لبریز ایسا تحقیقی اور تخلیقی عمل ہے جو وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ لکھنؤ کے بارے میں جو کچھ انھوں نے سُنا، دیکھا اور محسوس کیا وہ انھوں نے من و عن بیان کر دیا ہے۔ لکھنؤ کی معاشرتی زندگی سے وابستہ تمام حقائق کو انھوں نے پوری دیانت سے بیان کیا ہے۔ لکھنؤ کے باشندے ذوقِ سلیم اور بصیرت سے متمتع ہیں اسی بنا پر وہ اپنی تہذیب کو مستحکم انداز میں پروان چڑھانے میں کامیاب ہو گئے۔ اپنے اسلوب کو حق گوئی و بے باکی سے مزین کرنے والی اس جلیل القدر ادیبہ نے ذاتی مشاہدات، تجربات اور مطالعہ کو جس محنت سے الفاظ کے قالب میں ڈھالا ہے اُس کے اعجاز سے قاری چشمِ تصور سے لکھنوی تہذیب کو پروان چڑھتے دیکھ لیتا ہے۔ محترمہ عثمانہ اختر جمال نے تکلم کے سلسلوں میں تہذیب کی جستجو بہت دلچسپ انداز میں کی ہے۔ لفظ ''گھومنا'' کے استعمال پر انھوں نے

بہت خوب لکھا ہے۔ مصنفہ نے اپنی روح اور قلب کی گہرائیوں میں موجزن خیالات کو نہایت موثر انداز میں الفاظ کے قالب میں ڈھالا ہے۔ لکھنوی تہذیب کے ذکر میں شہر لکھنؤ کو ایک علامت سمجھنا چاہیے جو ایک نفسیاتی کُل کی صورت میں جلوہ گر ہے۔ دراصل مصنفہ نے دنیا بھر کے شہروں کو تہذیبی تار میں پروئے ہوئے ایسے دانوں کی ایک صورت سمجھا ہے جو اپنے اپنے مقام پر اپنے وجود کا اثبات کرتا ہے۔ لکھنؤ کی دعوتوں کا احوال بیان کرتے ہوئے وہ خود بھی ان دعوتوں میں شامل ہو جاتی ہیں۔ یہی بے ساختگی ہے جو قاری کو چشمِ تصور سے اُن تمام مقامات اور کرداروں سے متعارف کرا دیتی ہے جن کا مصنفہ نے اس کتاب میں ذکر کیا ہے۔ لکھنؤ کے باشندے محض اسی شہر کے روز و شب میں اُلجھ کر نہیں رہ جاتے بل کہ وہ کہکشاں پر ضوفشاں ستاروں سے بھی آگے کے جہانوں کی تسخیر کی تمنا اپنے دِل میں لے کر آگے بڑھنے اور گھوم پھر کر دنیا دیکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ آیئے دھنک کے اُس پار دیکھیں اور محترمہ عثمانہ اختر جمال کی گل افشانیٔ گفتار کی ایک مسحور کُن صورت دیکھیں:

''ابھی جب میں لکھنؤ گئی تو بدلی ہوئی زبان اور تہذیب دیکھ کر دنگ رہ گئی۔۔۔۔ جب کبھی لکھنؤ والے ایک دوسرے کو اپنے گھر بُلاتے تو کہتے تھے ''آپ ہمارے یہاں تشریف لایئے۔'' ''آپ ہمارے گھر آیئے ہم کو خوشی ہوگی۔'' میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ جب کسی نے مجھ سے کہا ''بہت دِن ہو گئے آپ انڈیا نہیں آئیں۔ آیئے لکھنؤ گھوم جایئے۔'' میں نے جواب دیا تھا ''لکھنؤ کو کیا گھومنا۔ وہ گھوما ہوا ہے۔ وہیں پیدا ہوئے ہیں پلے بڑھے ہیں۔ جب لوگ پہلی بار لکھنؤ آتے تھے تو ہم لوگ ضرور اُن کو لکھنؤ گھوایا کرتے تھے۔'' مجھ کو نہیں معلوم تھا وہ مجھے لکھنؤ آنے کی دعوت دے رہی ہیں جو میں سمجھ نہیں سکی۔ جب میں لکھنؤ گئی اور اُس وقت کسی نے مجھ سے کہا ''آپ لکھنؤ میں ہیں تو ہمارے یہاں بھی گھوم جایئے۔'' تو میں واقعی میں گھوم گئی۔ میری بہن نے بتایا ''اب جب بہت سے لوگ اپنے گھر آنے کی دعوت دیتے ہیں تو کہتے ہیں آیئے ہمارے یہاں گھوم جایئے۔'' (عثمانہ اختر جمال: لکھنؤ کی تہذیب، صفحہ 24)

جہاں تک لفظ گھومنا کے استعمال کی تاریخ کا تعلق ہے یہ لفظ اردو شاعری تخلیق کاروں نے کثرت سے استعمال کیا ہے۔ اس کی چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں:

رات کو باہر اکیلے گھومنا اچھا نہیں — چھوڑ آؤ اس کو گھر تک راستا اچھا نہیں — (افتخار نسیم)
نیم شب کی خامشی میں بھیگتی سڑکوں پہ کل — تیری یادوں کے جلو میں گھومنا اچھا لگا — (امجد اسلام امجد)
نام آوروں کے شہر میں گم نام گھومنا — اپنا تو اِک شعار ہے ناکام گھومنا — (شاہد رضوی)
نہ مجھے گھومنا ہے اور نہ گھر جانا ہے — شبِ ہجراں لبِ دریا ہی پہ مر جانا ہے — (تنہا لائل پوری)

گھومنا اور پھرنا ایسے الفاظ ہیں جو ایک ہی مفہوم کی ادائیگی کے لیے مستعمل ہیں۔

بے چین بہت پھرنا گھبرائے ہوئے رہنا — اِک آگ سی جذبوں کی دہکائے ہوئے رہنا — (منیر نیازی)

لکھنؤ کے باشندوں نے تہذیبی ارتقا کے سلسلے میں تشریف آوری اور قدم رنجہ فرمانے کے بعد گھومنے تک کا جو سفر کیا ہے وہ قارئین کی دلچسپی کا سامان لیے ہوئے ہے۔ برصغیر کے مختلف شہروں میں اپنے یہاں بلانے کے سیکڑوں طریقے مستعمل ہیں۔

جھنگ کی تہذیب کا نمایاں وصف یہ ہے کہ یہاں کے باشندے قناعت اور شانِ استغنا کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں۔ اس شہر کے باشندے بتانِ وہم و گماں کو توڑ کر تلخ حقائق سے آنکھیں چار کرنے اور کوہ کن کے مانند پہاڑ کاٹنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ کنگ پینے اور ساگ کھانے کے بعد اپنے خالق کی نعمتوں کے راگ گانے والے جھنگ کے مکینوں کے کردار کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے والے جھنگ رنگ کے ممتاز شاعر محمد شیر افضل جعفری (1909-1989) اپنے گھر آنے والے مہمانوں سے وقتِ رخصت یہ کہا کرتے تھے:

''اب جھنگ شہرِ سدا رنگ میں اگلا پھیرا کب ہوگا۔''

اے نسیم زاد جھونکوں کی حسیں کلیلو — ذرا جھنگ رنگ ٹیلوں کی طرف بھی ایک پھیرا
زندگی رَین بسیرے کے سِوا کچھ بھی نہیں — یہ نفس عمر کے پھیرے کے سِوا کچھ بھی نہیں

محسن کاکوروی (1825-1905) نے بھی لفظ ''پھیر'' کا استعمال کر کے اسلوب کو مسحور کن بنا دیا ہے:

طرفہ گردش میں گرفتارِ عجب پھیر میں ہے — سُرمہ ہے نیند مری دیدۂ بیدار کھرل
گزر کے آپ سے ہم آپ تک پہنچ تو گئے — مگر خبر بھی ہے کچھ پھیر کھائے ہیں کیا کیا — (یاس یگانہ چنگیزی)

جھنگ کے ممتاز شاعر سیّد جعفر طاہر بیرونِ شہر مقیم نونہالانِ چمن سے مخاطب ہو کر کہا کرتے تھے :
اب ہمارے شہر کے در و بام پر یہ چاند پھر کب طلوع ہوگا؟
سیّد ناصر رضا کاظمی نے استعاراتی انداز میں کہا تھا:

شام سے سوچ رہا ہوں ناصر — چاند کس شہر میں اُترا ہوگا (ناصر کاظمی)

محسن کاکوروی نے لفظ ''چکر'' کو گھومنے اور پھرنے کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔

پھر چلا خامہ قصیدہ کی طرف بعد غزل — کہ ہے چکر میں سخن گو کا دماغِ مختل (محسن کاکوروی)
اپنی تعبیر کے چکر میں مرا جاگتا خواب — روز سورج کی طرح گھر سے نکل پڑتا ہے (راحت اندوری)

فکرِ معاش، بروٹس قماش رشتہ داروں کی سازشوں اور فالج سے نڈھال جھنگ میں مقیم اردو کے مایہ ناز شاعر رام ریاض اپنی مواجی طبع کو روبہ عمل لاتے ہوئے اپنے قلبِ حزیں میں متعدد خیال باندھتے ہوئے اپنے احباب سے یہی کہتے تھے:

''تنہائی کی ایسی منزل آئی ہے کہ کوئی رہ گزر میرا ساتھ نہیں دیتی میرے نحیف جسم کا شیرازہ بکھرنے سے پہلے ایک بار ادھر کا چکر لگا جاؤ۔ آئینہ خانوں پہ زد پڑنے سے نہ ڈرو کسی روز ہمارے کھنڈر کا چکر لگا کر میرے ویرانۂ جاں میں مرجھائے پھول بھی دیکھو۔ کبھی ہمارے کوچے کا بھی چکر لگا لیا کرو جہاں وقت نے اُمیدوں کے سب نقوش دھندلا دیئے ہیں۔ اب اس شہرِ ناپرساں کی بے چراغ گلیوں کے چکر لگانے والے اپنی دُکان بڑھا گئے۔''

اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے خاندانوں میں کردار سازی اور اخلاقیات پر بہت توجہ دی جاتی ہے۔ اساتذہ کے فیضانِ نظر سے شاگرد علم و ادب کی منازل طے کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہر عمر کے لوگ اپنے مخاطب کی بات پوری توجہ سے سنتے ہیں اور اپنے جذبات و احساسات کو قابو میں رکھتے ہیں۔ کوئی بھی موضوع ہو وہ مبالغہ آرائی اور وادیٔ خیال میں مستانہ وار گھومنے کی روش پر گرفت کرتے ہیں۔ محترمہ عثمانہ اختر جمال نے متعدد مثالوں سے واضح کیا ہے کہ رنج کی گفتگو میں بھی لکھنؤ کے باشندے تہذیب کا خیال رکھتے ہیں اور آپ سے تم اور تم سے تُو کی نوبت کبھی نہیں آتی۔ لکھنؤ کے باشندے غمزۂ غماز پر گہری نظر رکھتے ہیں تا کہ مرغانِ بادنما، کینہ پرور اور حاسد رقیبوں کو شر انگیزی کا کوئی موقع نہ مل سکے۔ سادیت پسندی کے روگ میں مبتلا سفہا کے جور و جفا، مظالم اور ستم آزاری کے باوجود لکھنؤ کے باشندے اپنے غیظ و غضب کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوئی انتقامی ردِ عمل ظاہر نہیں کرتے اور نہ ہی کسی اتائی چارہ گر کے مرہم بہ دست آنے کا انتظار کرتے ہیں بل کہ اپنے قلب و جگر کے زخموں کو خود ہی رفو کرنے پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ آدابِ محفل میں ''پہلے آپ'' کو اب لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ رکشا ڈرائیور بھی کم سِن بچے سے یہ کہہ کر مخاطب ہوتا ہے کہ آپ ابھی چھوٹے ہیں میں آپ کو رکشے سے اُتار دیتا ہوں۔ انسانی ہمدردی کا یہ انداز لکھنوی تہذیب کی عطا ہے۔ بادی النظر میں احساسِ کم تری کے باعث انسان زود رنجی کا مظاہرہ کرتا ہے اور آپے سے باہر ہو کر تلخ کلامی یا گالی گلوچ پر اُتر آتا ہے۔ لکھنوی تہذیب میں احترامِ انسانیت پر خاص توجہ دی جاتی ہے اور رنج کی گفتگو سے بالعموم اجتناب کیا جاتا ہے۔

رنج کی جب گفتگو ہونے لگی — آپ سے تم، تم سے تُو ہونے لگی (داغ دہلوی)
آج مجھ کو بہت برا کہہ کر — آپ نے نام تو لیا میرا (جون ایلیا)
تُو ہے ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی — تُو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی (قلق میرٹھی)
تم تو کہتے تھے بہار آئی تو لوٹ آؤں گا — لوٹ آؤ مرے پردیسی بہار آئی ہے (احمد راہی)
محفل میں تیری آ کے یوں بے آبرو ہوئے — پہلے تھے آپ، آپ سے تم، تم سے تُو ہوئے (نوح ناروی)

محترمہ عثمانہ اختر جمال کے اسلوب کا مطالعہ کرنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ تخلیقی عمل کو دائمی راحت اور مسرت کا معدن سمجھتی ہیں۔ وہ ستائش اور صلے کی تمنا سے بے نیاز رہتے ہوئے پرورشِ لوح و قلم میں انہماک کا مظاہرہ کرتی ہیں نے لکھنؤ کی تہذیب کو پوری دنیا کے لیے ایک لائق تقلید مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ انھوں نے لکھنوی تہذیب کو روشنی کے ایک ایسے مینار کے طور پر پیش کیا ہے جو آنے والی نسلوں کے لیے منزلوں تک رسائی کی صورت پیش کرے گا۔ تاریخ، علم بشریات، عمرانیات اور فلسفہ سے اُنھیں گہری دلچسپی ہے وہ جانتی ہیں کہ اگر کسی خطے کی تہذیب کو نئی نسل تک منتقل کرنے میں غفلت کی جائے اور تہذیب کی منتقلی کی تاخیر کا عرصہ ایک صدی سے بڑھ جائے تو تو وہاں کی تہذیب ابلق ایام کے سموں کی

گرد میں اوجھل ہو جاتی ہے اور وہاں جنگل کے سخت اور بد بخت قانون کا غلبہ ہو جاتا ہے اور پورا معاشرہ پتھر کے زمانے کا ماحول پیش کرنے لگتا ہے۔
اپنی اس تصنیف میں محترمہ عثمانہ اختر جمال نے تہذیبی ارتقا کے لیے تمام ضروری عوامل کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اہلِ لکھنو نے تاریخ کے ہر دور میں جہد للبقا کو پیشِ نظر رکھا ہے خاص طور پر انھوں نے نوآبادیاتی دور میں مغربی تہذیب کی یلغار کے سامنے سپر انداز ہونے سے انکار کر کے جریدۂ عالم پر اپنا تہذیبی دوام ثبت کر دیا۔ محترمہ عثمانہ اختر جمال نے اس کتاب میں تاریخ کے پیہم رواں عمل کی جانب متوجہ کیا ہے۔ ایامِ گزشتہ کی کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے مصنفہ نے متعدد مثالوں اور حوالوں سے اس امر کی صراحت کر دی ہے کہ ماضی کی یادیں اپنے دامن میں مستقبل کے لیے بہت سی چشم کشا صداقتیں اور حکایتیں لیے ہوئے ہیں۔ تہذیبی میراث کی یہ نشانیاں آنے والی نسلوں کے لیے ایسا قابلِ عمل طرزِ زندگی پیش کرتی ہیں جو منزلوں کی جستجو میں بے حد معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اپنے بچپن اور زمانہ طالب علمی کی جد و جہد کا ماضی کے واقعات سے انسلاک، رفتگاں کی یادوں، اسلاف کے فکر پرور اور خیال افروز مباحث سے تہذیب کو صیقل کرنے کی تمنا اُن کے اسلوب کا نمایاں ترین وصف ہے۔ مثال کے طور پر میر تقی میر کی قبر کے آثار اور کتبہ تک مٹ جانا نشانِ عبرت ہے۔ نوآبادیاتی دور میں میر تقی میر کے مزار پر لکھنور یلوے لائن کا گزرنا اور وہاں ریلوے سٹیشن کی تعمیر ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ برطانوی استعمار کے فسطائی جبر پر وہ بہت دل گرفتہ ہیں اور ان کی تحریر میں ماضی کے حالات، نوآبادیاتی دور میں لکھنؤ کے باشندوں پر ٹوٹنے والے کوہِ ستم پر ان کے جذبات و احساسات اُن کی تحریر کے ایک ایک لفظ میں نمایاں ہیں۔ محترمہ عثمانہ اختر جمال نے نوآبادیاتی دور میں لکھنؤ کے باشندوں کے فکر و خیال کی منہاج اور مظلومیت کی جس درمندی سے لفظی مرقع نگاری کی ہے وہ اُن کی انسان دوستی اور حب الوطنی کی عمدہ مثال ہے۔ بے مہریٔ عالم کے ایک نوحے کی صورت اختیار کر جانے والی یہ تحریر پڑھ کر قاری کی روح زخم زخم اور دِل کرچی کرچی ہو جاتا ہے اور اُس کی آنکھوں سے جوئے خوں رواں ہو جاتی ہے۔

لکھنؤ کی تاریخ اور یہاں کے باشندوں کے طرزِ زندگی سے محترمہ عثمانہ اختر جمال کو گہری دلچسپی ہے۔ انھوں نے لکھنؤ کے مہذب اور زندہ دِل لوگوں کی تسبیحِ روز و شب کا دانہ دانہ شمار کر کے قارئین کو چشمِ تصور سے اس شہرِ بے مثال کی تہذیب کا دھنک رنگ منظر نامہ دیکھنے پر مائل کیا ہے۔ لکھنؤ کے باشندوں نے تاریخ کے ہر دور میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر قسم کے صبر آزما حالات اور کٹھن مسائل کا خندہ پیشانی سے سامنا کیا۔ ان کی وضع داری، انسانی ہمدردی، خلوص و مروّت، مہمان نوازی، سخاوت اور خدا ترسی کی مثالیں اس کتاب کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہیں۔ لکھنؤ کے باشندوں کی زندگی کے مختلف پہلو اس شہر کی تہذیب کو جو نکھار عطا کرتے ہیں وہ باہر سے آنے والوں کی نگاہوں کو خیرہ کر دیتے ہیں۔ مصنفہ نے لکھنؤ کی تہذیب کا جس خوب صورت انداز میں ذکر کیا ہے اس نے تخلیقِ ادب کو مقاصد کی رفعت کے اعتبار سے ہم دوش ثریا کر دیا ہے۔ لکھنؤ شہر اور یہاں کے باشندوں کی تصویر دیکھ کر قاری کے ذہن پر جو نقش مرتب ہوتا ہے وہ اس قدر پر کشش ہے کہ دل میں اس شہرِ بے مثال کو دیکھنے اور یہاں کے وضع دار باشندوں سے ملنے کی تمنا پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وہ دل نشیں لمحہ ہے جب قاری اپنے ذاتی حوالوں کے حصار سے نکل کر آفاقی سوچ کو بروئے کار لاتے ہوئے اقوامِ عالم اور مختلف شہروں کے معاشرے کے بارے میں جان کر مسرت حاصل کرتا ہے۔

لکھنؤ کی تہذیبی میراث کا یہ معتبر حوالہ وہاں کی معاشرتی روایات، زندگی کی اقدارِ عالیہ، آدابِ معاشرت، رہن سہن اور عادات و اطوار کے بارے میں تمام معلومات کا ایسا مخزن ہے جسے پڑھ کر ادب کا ہر باذوق قاری اَش اَش کر اُٹھتا ہے۔ جذبہ انسانیت نوازی اور انسانیت شناسی میں مصنفہ نے بہت محنت اور خلوص کا ثبوت دیا ہے۔ انسانی ہمدردی، خلوص، مروّت، ایثار اور وفا سے متعلق تمام امور اس کتاب میں شامل ہیں۔ محترمہ عثمانہ اختر جمال نے لکھنوی تہذیب کی مرقع نگاری کرتے وقت خون بن کر رگِ سنگ میں اُترنے کی جو سعی کی ہے وہ ہر اعتبار سے لائقِ تحسین ہے۔ انھوں نے لکھنؤ کے باشندوں کی کتابِ زیست کے اُن اوراق پر بھی نظر ڈالی ہے جو اب تک ناخواندہ رہے ہیں۔ اِس دورِ بیگانگی میں جہاں ہر کوئی اپنی فضا میں مست پھرتا ہے فاقہ کش، مجبور اور بے بس انسانوں کی چشمِ تر کو دیکھ کر اُن کے ساتھ اپنائیت کا جو انداز مصنفہ نے اپنایا ہے وہ اُن کی عظمتِ فکر کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ لکھنؤ شہر کی تہذیبی میراث کا ذکر اس کتاب کا اہم ترین موضوع ہے۔ مصنفہ نے فکر و خیال اور تحلیل و تجزیہ کو زادِ راہ بناتے ہوئے لکھنؤ کی تہذیبی اساس پر جس تدبر کے ساتھ قلم اُٹھایا ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ کسی بڑے شہر کی تہذیب پر یہ ایسا تحقیقی کارنامہ ہے جس میں کوئی اُن کا شریک و سہیم نہیں۔ لکھنؤ کی تہذیب پر اس کتاب کے مطالعہ سے اذہان کی تطہیر و تنویر کا موثر اہتمام کیا گیا ہے۔ اس تصنیف میں نوآبادیاتی دور اور پس نوآبادیاتی دور میں لکھنؤ کی تہذیبی ترقی کے بارے میں حقیقت پسندانہ انداز میں تمام متعلقہ حقائق کو یک جا کر دیا گیا ہے۔ اس میں لکھنؤ کے باشندوں کی ذہنی اور شعوری بالیدگی کے بارے میں جن حقائق کو شامل کیا گیا ہے ان میں مصنفہ کی ذاتی تجربات، مشاہدات اور تاثرات کو اوّلین ماخذ کی

حیثیت حاصل ہے۔ نئی نسل کے ذہن و شعور اور فہم و ادراک کو مہمیز کرنے کے لیے ایسی تحقیقی کتب کی اہمیت و افادیت مسلمہ ہے۔

قحط الرجال کے موجودہ زمانے میں موسیقار اور ڈرائیور جو ایک زمانے میں سکونِ قلب کی دولت فراہم کرتے تھے اب اپنی دکان بڑھا گئے ہیں۔ لکھنؤ کے رکشا والوں کے تکیہ کلام کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی۔ منزلِ مقصود تک جلد پہنچنے کے لیے بے چین مسافروں کے ساتھ کرایہ طے کرنے کے سلسلے میں اُن کا روّیہ اکثر پریشان کن ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے مسافر اِن کے لہجے سے دِل بُرا نہیں کرتے۔ محترمہ عثمانہ اختر جمال نے لکھنو کی تہذیب میں پل کر جوان ہونے والے نئے دور کے رکشا ڈرائیوروں کے اندازِ گفتگو کے متعلق نہایت دلچسپ انداز میں لکھا ہے:

''ایک بار جب ہم لوگ نویں کلاس میں تھے میں اور میری چھوٹی بہن اپنی دوست کے گھر جا رہے تھے۔ بڑی مشکل سے ایک رکشہ مِلا اس جگہ کے لیے جہاں مجھے جانا تھا۔ رکشے والا بہت زیادہ پیسے مانگ رہا تھا۔ کافی بحث کے بعد وہ اتنے پیسوں پر راضی ہوا جو اُس جگہ کا کرایہ تھا۔ ہمارا اُدھر بہت آنا جانا تھا اس لیے ہم ریٹ خراب نہیں کرنا چاہتے تھے اور کرایہ بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔''

مصنفہ اسی رکشا میں جا رہی تھی کہ دورانِ سفر رکشا ایک ٹھیلے سے ٹکرا گیا جس کے نتیجے میں بوڑھا رکشا والا زخمی ہو گیا۔ مصنفہ نے رکشا ڈرائیور کو دوا علاج، مرہم پٹی اور ٹیٹنس کا ٹیکہ لگوانے کے لیے درکار رقم دی تو رکشا والا ممنونیت کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے بولا:

''اپنے گاؤں میں جیسا لکھنؤ کے بارے میں سُنا تھا ویسا ہی پایا۔ جو بٹیا لوگ ذرا سے زیادہ کرائے پر بحث کر رہی تھیں پچیس پیسے زیادہ دینے کو تیار نہیں تھیں انھوں نے اپنے پورے پیسے اِس غریب کو دے دیا کہ کہیں لوہا لگنے سے مجھے ٹیٹنس نہ ہو جائے میرے گھر والے بے سہارا نہ ہو جائیں۔ بغیر کسی جان پہچان کے اتنی انسانیت اتنی بڑائی جو لکھنؤ کی سُنی تھی وہ دیکھ لی، لکھنؤ کی تہذیب کی جے ہو۔''

(عثمانہ اختر جمال: لکھنؤ کی تہذیب: صفحہ 39)

رختِ حیات پیہم رواں دواں ہے انسان کا نہ تو باگ پر ہاتھ ہے اور نہ ہی اس کے پاؤں رکاب میں ہیں۔ ڈرائیوروں کا بھی یہی حال ہے وہ پیسہ کمانے کی دوڑ میں سب سے آگے نکل جانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اکثر ڈرائیور یہی چاہتے ہیں کہ شام سے پہلے ہی اس قدر کمائی کر لیں کہ گھر کا خرچ پورا ہو جائے خواہ اس حرص و ہوس کے نتیجے میں مسافروں کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ بچے۔ لکھنؤ کے لوگ مجبوروں، دردمندوں اور غریبوں کی مدد تو کرتے ہیں مگر نمود و نمائش کی خاطر وہ حاتم طائی کی قبر پر لات مارنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔

''باہر سڑک پر بہت بھیڑ تھی رکشے والوں کے مزاج نہیں مِل رہے تھے۔ رکشے والے رُکتے مگر یہ کہتے کہ آنا نہ جانا کہہ کر چلے جاتے۔ ہم اُن کے برتاؤ سے ڈر رہے تھے۔ ایک رکشے والا بولا جانا ہے تو بیٹھو نہیں جانا تو جاؤ۔ ہم لوگ جلدی سے بیٹھ گئے۔'' جب دوست کے یہاں پہنچے تو کہا ''یہاں کے رکشے والے کتنے بدتمیز ہیں عجیب طرح سے بات کر رہے تھے۔'' یہ سُن کر وہاں سب لوگ بہت ہنسے رکشے والے بدتمیز نہیں تھے۔ اُن کی زبان ایسی ہے، آپ کو لکھنؤ کے رکشے والوں کی زبان سننے کی عادت ہے۔ اس لیے اُن کی زبان کی وجہ سے آپ لوگوں کو اُن کا برتاؤ بُرا لگ رہا تھا۔'' واقعی میں لکھنؤ کے رکشے والوں، تانگے والوں اور یکے والوں کی زبان، رکھ رکھاؤ سے بھی وہاں کی تہذیب کا پتا چلتا تھا۔'' (عثمانہ اختر جمال: لکھنؤ کی تہذیب: صفحہ 39)

رکشا ڈرائیور بالعموم بہت حساس اور زود رنج ہوتے ہیں۔ نئے دور میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری کے باعث بہت سے تعلیم یافتہ نوجوان شہروں اور دیہاتوں میں موٹر سائیکل رکشا چلا کر رزقِ حلال کماتے ہیں۔ مجھے جھنگ کے قدیم شہر کے نواح میں واقع ہیر رانجھے کے مقبرے اور فوارہ چوک جھنگ کے درمیان چلنے والے رکشا ڈرائیور یاد آ گئے۔ سواریوں کے انتظار میں کھڑے ان رکشا ڈرائیوروں میں سے اکثریت تعلیم یافتہ ہوتی ہے۔ ان باذوق رکشا ڈرائیوروں کے رکشے میں نصب ٹیپ ریکارڈ میں یہ گانا لگتا ہے تو وہاں موجود مسافر فوراً رکشے کی جانب لپکتے ہیں۔ پنجابی تہذیب و ثقافت کے ممتاز محقق پروفیسر ڈاکٹر محمد ریاض شاہد نے بتایا کہ انھوں نے مرزا صاحباں کی قبر پر مسافروں کو لے جانے والے رکشوں میں بھی یہی گیت سنا ہے۔ اسحاق ساقی نے پنجاب کی رومانی لوک داستانوں پر تحقیقی کام کیا وہ سوہنی اور مہینوال کی یاد میں دریائے چناب کے کنارے تعمیر ہونے والی نشانی پر گجرات پہنچے تو وہ حیران رہ گئے کہ وہاں کے رکشا ڈرائیور بھی اسی گیت کے ذریعے مسافروں کو بُلاتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے بھارتی فلم پاکیزہ (1972ء) کے گانے کے بول ہی ایسے ہیں کہ رومانی لوک داستانوں کے گرویدہ مسافر اپنی پسندیدہ منزل کی جانب روانہ ہونے کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں۔

چلو دِل دار چلو چاند کے پار چلو ہم ہیں تیار چلو
آؤ کھو جائیں ستاروں میں کہیں چھوڑ دیں آج یہ دنیا یہ زمیں

چلو دِل دار چلو چاند کے پار چلو ہم ہیں تیار چلو
زندگی ختم بھی ہو جائے اگر نہ کبھی ختم ہو اُلفت کا سفر
چلو دِل دار چلو چاند کے پار چلو ہم ہیں تیار چلو

اس کتاب کے مطالعہ سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ مصنفہ کا تعلق اقلیم معرفت سے ہے۔ اُنھوں نے اصولِ جامعیت اور اُصولِ کفایت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے تبحرِ علمی، وسعتِ نظر اور ذوقِ سلیم کو اس جامِ جہاں نما میں سما دیا ہے۔ پس نو آبادیاتی دور میں دوسرے شہروں کی طرح اس شہرِ بے مثال کی تہذیب کو لامحدود عصری چیلنجز کا سامنا رہا ہے۔ محترمہ عثمانہ اختر جمال نے اپنی تخلیقی اور تحقیقی فعالیت سے اِن چیلنجز کو بڑی حد تک محدود کر دیا ہے اور اِسے اندیشۂ زوال سے نا آشنا کر دیا ہے۔ روحانیت کے اعجاز سے انھیں جو وسعت نظر نصیب ہوئی ہے وہ انھیں دُکھی انسانیت کی خدمت پر مائل کرتی ہے اور وہ بلا امتیاز دردمندوں، ضعیفوں، ناداروں اور بیماروں کی امداد کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہیں۔ اِس کتاب میں اُنھوں نے تیشۂ حرف سے فصیلِ جبر کو منہدم کرنے کی جو سعی کی ہے اُس کی بنا پر تاریخ ہر دور میں اُن کے نام کی تعظیم کرے گی۔ وہ ہر کام اللہ کریم کی رضا کی خاطر کرتی ہیں اور یہی مثبت سوچ اُن کی کامیابی، راحت اور مسرت کا اہم وسیلہ ہے۔ عملی زندگی میں انھوں نے سدا صحت مند اور مثبت اندازِ فکر اپنایا ہے اس لیے سارے جہاں کا درد اُن کی روح اور قلب میں سما گیا ہے۔ خدمتِ خلق اور تخلیقِ ادب کو انھوں نے ایک طرزِ زندگی کا انداز عطا کیا ہے۔ ان کے اسلوب کو علم و ادب کے ایک گل دستے کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے جس میں انھوں نے اپنی زندگی کے ایسے پھول جمع کر دیے ہیں جن کی عطر بیزی سے قریۂ جاں معطر ہو جاتا ہے۔ اس کتاب میں پیرا سائیکالوجی اور مابعد الطبیعات کے افکارِ تازہ سے مزین جو حوالے موجود ہیں وہ قاری کو ایک جہانِ تازہ میں پہنچا دیتے ہیں۔ انھوں نے ہیرے، جواہرات، نباتات و جمادات اور ستاروں کی گردش سے انسانی مقدر کو کبھی وابستہ نہیں کیا۔ اُن کا خیال ہے کہ داخلی کیفیات ہی افراد کے فکر و خیال اور زندگی کے نشیب و فراز کی اساس بنتی ہیں۔ زندگی کے مختلف موسموں کو مقدر کے کھاتے میں ڈالنا مناسب نہیں۔ وہ اپنی دنیا آپ پیدا کرنے پر اصرار کرتی ہیں۔ اس کتاب میں ایسے متعدد واقعات مذکور ہیں۔ اس کی چند منتخب مثالیں پیش ہیں:

محلے میں رہنے والی ایک بیوہ بوا کو مالی امداد کی فراہمی انسانی ہمدردی کی عمدہ مثال ہے۔ بے سہارا بیوہ کو سلائی مشین فراہم کرنے کے لیے کوشش کرنا بھی جذبۂ انسانیت نوازی کا ثبوت ہے (صفحہ 32)

بہرائچ سے ہجرت کر کے لکھنؤ آنے والی نادار ضعیفہ جس کی کمر ضعف پیری سے جھک گئی تھی اُس کی مالی امداد فراہم کر کے مصنفہ نے خدا ترسی کا ثبوت دیا۔ اس ضعیفہ کے لیے ملبوسات، علاج اور نقد رقم کا انتظام کر کے مصنفہ نے بہت نیک کام کیا۔ مصنفہ جب امریکہ سے واپس لکھنو آتی ہیں تو محلے کی غریب عورت بھابی دھوبن کو گلے لگا کر ملتی ہیں اور اُس کی مالی امداد کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فاقہ کش اور بیمار بھابی دھوبن اپنی دعاؤں میں کہتی ہے:

''اللہ میری امریکہ والی بٹیا کو سلامت رکھے۔''

اس کتاب میں مذکور ہے کہ لکھنؤ میں لفظ ''یار'' کا استعمال ذوقِ سلیم پر بار ثابت ہوتا ہے۔ مصنفہ نے لکھا ہے کہ وہ اپنی ایک دوست کے ہمراہ مونگ پھلی خریدنے کے لیے ایک خوانچے والے کے پاس رکشے میں پہنچیں۔ مصنفہ کی سہیلی کسی دوسرے شہر سے نئی نئی آئی تھی اُس نے رکشے والے سے مخاطب ہو کر کہا: ''اماں یار جلدی کرو میری دوست کو دیر ہو رہی ہے''

مونگ پھلی والا جلدی سے بولا ''بٹیا صاحب آپ بڑے گھر کی ہیں۔ بڑے گھر کی لڑکیاں یار نہیں بولتی ہیں۔ ہمارے لکھنؤ میں بُرا سمجھا جاتا ہے۔'' (عثمانہ اختر جمال: لکھنؤ کی تہذیب، صفحہ 41)

اُردو کی کلاسیکی شاعری میں لفظ ''یار'' کو ہمدرد ساتھی، مونس و غم خوار دوست، غم گسار، محرم، معتمد، رفیق اور صلاح کار کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ کئی محاورات اور ضرب الامثال میں بھی ''یار'' اچھے معنوں میں لایا گیا ہے۔ مثلاً: یار زندہ صحبت باقی، ہمہ یاراں دوزخ ہمہ یاراں بہشت

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں (انشا اللہ خان انشا)
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو جسے پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بے کار بیٹھے ہیں (انشا اللہ خان انشا)
نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا (شیخ محمد ابراہیم ذوق)
فراق کیا ہے اگر، یادِ یار دِل میں رہے خزاں سے کچھ نہیں ہوتا بہار دِل میں رہے (جون ایلیا)
قفس اُداس ہیں یارو صبا سے کچھ تو کہو کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے (فیض احمد فیض)

پنجابی، ہندکو، سرائیکی اور پوٹھوہاری زبان کی کلاسیکی شاعری میں بھی لفظ ''یار'' ہمیشہ مونس وغم گسار ساتھی کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

ٹُر گئے یار محبتاں والے نالے لئے گئے ہاسے دِل نہیں لگدا یار محمد نے جایئے کیہڑے پاسے (میاں محمد بخش)

تہذیب کی بقا کے لیے بلند پروازی ناگزیر ہے۔ عمرانیات، نفسیات، علم بشریات اور تاریخ کے ممتاز محقق پروفیسر حاجی حافظ محمد حیات کا کہنا تھا کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں مستعمل الفاظ کے مفاہیم بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ لسانی تغیر وتبدل کے اس پیہم رواں عمل کو وہ تکثیریت کی ایک صورت سے تعبیر کرتے تھے۔ پس نوآبادیاتی دور میں جن الفاظ کے معانی یکسر بدل گئے اُن میں لفظ ''یار'' بھی شامل ہے۔ حرص وہوس کی جبلت پر قابو پا کر بے لوث انداز میں انسانیت کی خدمت کرنے والے لوگ تہذیبی ارتقا میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ لکھنؤ میں تکلم کے سلسلوں میں لفظ ''یار'' کا استعمال معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ذخیرۂ الفاظ کا تنوع دیکھ کر خیال آتا ہے کہ فکر وخیال کی وحدت کا حصول اب سراب نہیں بل کہ ایک حقیقت کا رُوپ ڈھال چکا ہے۔ منہ پھٹ اور بے غیرت لوگ فحاشی کے ذریعے تہذیبی معائر کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں بروٹس قماش کے یار کو گلے کا ہار بنانا ایک آزار بن جاتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ماضی کی حسین یادوں کا امین یہ لفظ اَب رذیل طوائفوں کے قحبہ خانے میں دادِ عیش دینے والے عیاش جنسی جنونیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً: بُرے ہیں سب مصبو کے یار پُرانے گئے تو نئے تیار

پس نوآبادیاتی دور میں برصغیر میں بننے والی فلموں کے نغموں میں لفظ ''یار'' بالعموم جنسی جنون اور ہوس سے آلودہ محبت کے لیے مستعمل رہا ہے۔ مجاز جب حقیقت کو ڈھانپ لے اور قلب وروح کی وجدانی کیفیات عنقا ہونے لگیں اور اُن کی جگہ سراپا نگاری اور سستی جذبات نگاری سے آلودہ تعلق کو پسند کیا جانے لگے تو محض الفاظ کی معنویت ہی نہیں بدلتی سننے والوں کی نیّت بھی بدل جاتی ہے۔ موجودہ دور میں لفظ ''یار'' ایک کریہہ صورت اختیار کر گیا ہے جس سے عفونت اور سڑاند کے بھبھوکے اُٹھتے ہیں۔ جھنگ میں جنگل بیلے کے علاقے میں ایک جگہ ''گھڑے بھن'' ہے۔ اس مقام سے آگے دریائے چناب کے کنارے ایک گھنا جنگل ہے جس میں سرکنڈے، ببول، بیری، جنڈ، اُکانہہ، لانی، اکڑا، کریریں، حنظل، تھوہر، پٹھ کنڈا، لیہہ، کانگہاری، جوانہہ اور کسکوٹا کی فراوانی ہے۔ دریائے چناب کے کنارے واقع گھڑے بھن کی یہ جھاڑیاں، کن کھجوروں، گھڑیالوں، مگرمچھوں، بچھوؤں، ناگوں، درندوں، بھوتوں، چڑیلوں اور پُراسرار آسیبی قوتوں سے بھری پڑی ہیں۔ سوہنی کمہاری کا آشنا مہینوال (عزت بیگ) بلخ بخارے کا شہزادہ تھا مگر محبت میں سب کچھ داؤ پر لگانے اور دِل کے بازار میں خسارہ کرنے کے بعد یہ کرب گوارا کر کے چرواہا بن گیا۔ گجرات کے نواحی گاؤں کے باشندوں نے اُسے شہر سے نکال دیا تو اُس نے دریائے چناب کے دوسرے کنارے پر جھگی بنا کر بسیرا کر لیا۔ سوہنی کمہاری نصف شب کے بعد دریائے چناب کے کنارے پہنچتی اور اپنے باپ تلا کمہار کی بھٹی کا تیار کیا ہوا وہ پکا گھڑا سرکنڈوں میں چھپا کر رکھتی تھی اُٹھاتی اور گھڑے پر تیر کر دریائے چناب کے دوسرے کنارے ایک جھگی میں منتظر اپنے یار سے ملنے پہنچ جاتی۔ سوہنی کے ساتھ فریب یہ ہوا کہ اُس کی نند نے ایک شام گھڑا بدل دیا اور پکے گھڑے کی جگہ ایک کچا گھڑا رکھ دیا۔ سوہنی حسبِ معمول مقررہ مقام پر پہنچی، گھڑا اُٹھایا اور نتائج سے بے پروا ہو کر دریائے چناب کی طوفانی لہروں میں چھلانگ لگا دی۔ پلک جھپکتے میں کچا گھڑا پانی میں گھل گیا، سوہنی ڈوب گئی۔ سوہنی کی چیخ پکار سُن کر مہینوال نے بھی دریائے چناب میں چھلانگ لگا دی اور وہ بھی دریا کی منجدھار میں ڈوب کر رُل گیا۔ تریموں (جھنگ) کے مقام پر دریائے جہلم اور چناب کے سنگم کے قریب ہلکی پھاٹ کے نواح میں رہنے والے بوڑھے مقامی ماہی گیر، ملاح، موہانے اور گلہ بان اپنے اسلاف کے حوالے سے یہ روایت کرتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں گجرات سے دریائے چناب کی لہروں میں بہہ کر آنے والی تلا کمہار کی بیٹی سوہنی اور اُس کے آشنا مہینوال کی لاشیں انہی خاردار جھاڑیوں میں اٹکی ہوئی ملی تھیں۔ انھیں دریائے چناب کے مشرقی کنارے کے نزدیک دفن کیا گیا مگر اپنی طغیانیوں سے کام رکھنے والا دریا کا کٹاؤ سب کچھ بہا لے گیا۔ نوآبادیاتی دور میں گھڑے بھن کے مقام پر ہر سال جون کے مہینے میں ایک میلہ لگتا تھا۔ سیال کوٹ میں پُورن بھگت کا کنواں ہو یا گھڑے بھن کا میلہ شہر اور مضافات کے سب البیلے لڑکے اور چنچل لڑکیاں وہاں ضرور پہنچ جاتے تھے۔ گھڑے بھن کا میلہ دیکھنے کے لیے تماشائی عورتیں بن ٹھن کر اور تن کر گھر سے نکلتی تھیں اور جنگل بیلے میں پھن لہراتے کالے ناگوں سے بھی نہیں ڈرتی تھیں۔ پس نوآبادیاتی دور میں گھڑے بھن کے میلے میں گامی کمہار اور اُس کی بیٹیاں ظلی، رابی، مسبو، شگن، صباحت، پینو اور سمن سرکنڈوں میں کچے گھڑے رکھ دیتی تھیں۔ گرد ونواح سے آنے والی نوجوان لڑکیاں سوہنی کمہاری سے اظہار یک جہتی کے لیے کچے گھڑے کو ٹھوکر مار کر توڑ دیتی تھیں اور اُس کی جگہ ایک پکا گھڑا خرید کر رکھ دیتی تھیں۔ یہی اس علاقے کی ثقافت ہے جو اقتضائے وقت کے مطابق پیہم ارتقا کے مدارج طے کرتی چلی آ رہی ہے۔ گامی

کمہار اِن رومان پسند لڑکیوں سے کچے اور پکے گھڑوں کے منھ مانگے دام وصول کرتا تھا۔ نوجوان لڑکیوں کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے وہ اپنے سسرال کی سازشوں اور نندوں کے مکر کی چالوں سے محفوظ رہ سکتی ہیں۔ گھڑے بھن کے میلے میں سرکس اور موت کا کنواں تماشائیوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا تھا۔ موت کے کنویں میں سیاہی وال سے تعلق رکھنے والی ایک عیاش اور جنسی جنونی ٹرانس جنڈر انٹرسیکس مصبہا بنونیم عریاں لباس پہن کر موٹر سائیکل چلاتی تھی۔ اس قسم کا جنسی جنون، عریانی، فحاشی اور بے حیائی تہذیب وثقافت کو افراتفری کی بھینٹ چڑھا کر نا قابلِ تلافی نقصان پہنچاتا ہے۔ پس نوآبادیاتی دور میں عریانی، فحاشی اور جنسی جنون نے ایک ایسے کینسر کی صورت اختیار کر لی ہے جس نے پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اُس ٹرانس جنڈر انٹرسیکس کا گایا ہوا یہ نغمہ بہت مقبول تھا۔ یہ گانا سُن کر تماشائی اِس ٹرانس جنڈر انٹرسیکس پر نوٹوں کی بارش کر دیتے تھے۔

یار بادشاہ یارِ دِل رُبا
قاتل آنکھوں والے اودلبر متوالے دِل ہے تیرے حوالے
یار بادشاہ یارِ دِل رُبا
مستانے البیلے میری بات سمجھ لے دِل کی دھڑکن سُن کر جذبات سمجھ لے
کیوں تڑپائے آجا دِل گھبرائے آجا، چین نہ آئے آجا
یار بادشاہ یارِ دِل رُبا (بھارتی فلم CID 909.1967)

لکھنؤ کے باشندوں نے اخلاقیات، وفا، مروّت، ایثار اور احترامِ انسانیت کے عطر بیز پھولوں سے تہذیب کا جو عرق کشید کیا ہے اس دورِ بیگانگی کے ہر معاشرتی برائی کا وہ موثر علاج ہے۔ مصنفہ نے کوشش کی ہے کہ لکھنؤ کی تہذیب کو درپیش خطرات سے نئی نسل کو آگاہ کرے۔ اصلاح معاشرہ کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا بالخصوص لکھنؤ میں مقیم مجبور خواتین کے ساتھ مروّت اور شفقت سے پیش آنا لکھنوی تہذیب کا لائق صد رشک وتحسین وصف ہے۔ لکھنوی معاشرے میں خواتین کو شرم وحیا اور اخلاقیات کی تربیت کے لیے تمام دستیاب وسائل بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ لکھنؤ میں اپنی مدد آپ کے تحت خواتین کی فلاح کے متعدد منصوبوں پر رازداری سے کام جاری رہتا ہے۔ ضرورت مند خواتین کے لیے ہفتے کا ایک دِن مقرر ہے۔ کاش یورپ میں بھی خواتین کو اخلاقیات کی تربیت دینے کا کوئی ایسا ہی انتظام ہوتا تو وہاں وہاں سب بلائیں تمام ہونے کے بعد خواتین مرگِ ناگہانی کی اس طرح تمنا نہ کرتیں جس طرح سیفو غروبِ آفتاب کے وقت جزیرہ لیوکاس کی سفید چٹان کی بلندی سے بحیرہ روم میں چھلانگ لگا کر یقینی موت کے منھ میں چلی گئی تھی اور اٹھائیس مارچ 1941ء کو ورجینا وولف نے اپنے کوٹ کی جیب میں پتھر ڈال کر شمالی یارک شائر برطانیہ میں اپنے گھر کے نزدیک بہنے والے دریائے آؤز میں کُود کر اپنی زندگی کا خاتمہ کیا تھا۔ سات فروری 1587ء کو میری کوئن آف سکاٹ کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ خدا ترسی اور انسانی ہمدردی لکھنؤ کی تہذیب کا ایسا وصف ہے جس پر پوری دنیا کے باشندے لکھنؤ کی تعریف کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے باشندوں کی سخاوت اور دریادِلی کے واقعات کے ہر جگہ چرچے ہیں۔ محترمہ عثمانہ اختر جمال نے اپنے تاثرات میں لکھا ہے:

''سب لوگ ضرورت مندوں کی مدد کے لیے تیار رہتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ ہر جگہ کے لوگوں کو اور سب کو ایسی توفیق دے۔ یہ صرف لکھنؤ کی ہی نہیں ہر جگہ کی انسانیت کی داستان بن کر تہذیب کے سانچے میں ڈھل جائے۔ (عثمانہ اختر جمال: لکھنؤ کی تہذیب، صفحہ 35)

لکھنؤ کے لوگ پیسہ مانگنے کے لیے آنے والے گداگروں کے ساتھ بھی خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں۔ ایک ضعیفہ بھکارن جس کی کمر میں علالت اور بڑھاپے کے ضعف کے باعث خم تھا کے ساتھ مصنفہ کے خاندان کے افراد نے بہت اچھا سلوک کیا۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنی تصنیف مخدرات (1913) میں ممتاز خاتونانِ ارض کے احوال پر جن فکر پرور خیالات کا اظہار کیا ہے شاید مصنفہ نے اُن سے گہرا اثر قبول کیا ہے۔ مصنفہ کے گھر میں ایک دعوت کے وقت اچانک پہنچنے والی ایک معمر بھکارن کے متعلق جس انداز میں حقائق بیان کیے گئے وہ چشم کشا صداقتوں سے لبریز ہیں۔ بھکارن نے جب گھر میں تقریب دیکھی تو وہ مایوسی اور اُداسی کے عالم میں اس نتیجے پر پہنچی کہ اُس کا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ اپنی کٹیا میں فاقہ کشی کی دعوتوں کی عادی یہ بڑھیا واپس جانے لگی مگر اُسے روک لیا گیا اور اُسے تقریب میں شامل کر لیا گیا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ غریبوں کی مجبوریاں، بیماریاں اور تکلیفیں اس قدر بڑھ جاتی ہیں کہ وہ ہر وقت احساس محرومی کی آنچ پر سلگتے رہتے ہیں۔ اس تقریب میں ہمدردی کا ایک لفظ بھی اُس مجبور و بے سہارا ضعیفہ کے لیے پر تکلف ضیافت کے مانند تھا۔ مصنفہ نے مجبور فقیروں کے حالات کا جس انداز میں ذکر کیا ہے اُسے پڑھ کر آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

''بڑی بی ہمیشہ کی طرح آئیں مگر جب اتنے بہت سے لوگوں کو دیکھا تو گھبرا گئیں۔ سمجھیں کہ غلط وقت پر آئیں۔ گھر میں کوئی فنکشن

ہے تو وہ واپس جانے لگیں مگر انھیں جانے نہیں دیا گیا اور روک لیا گیا۔ وہ زمیں پر بیٹھنے لگیں۔ فقیرنی تھیں تو کیا اتنی بزرگ خاتون تھیں زمین پر کیسے بیٹھنے دیا جاتا۔ وہ امی کے قریب بیٹھتی تھیں۔ اُن کے لیے امی کے قریب والی کرسی خالی کر دی گئی۔ سب سے پہلے اُن کو چائے اور ناشتہ دیا گیا۔ اس کے بعد دوسرے مہمانوں کو دیا گیا۔ اُن کو کھانے کے لیے بھی روک لیا گیا۔ اپنی اتنی خاطر دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔'' (عثمانہ اختر جمال: لکھنؤ کی تہذیب، صفحہ 32)

لکھنؤ کی تہذیب پر یہ تحقیقی کتاب روشنی کے سفر کا آغاز ہے۔ محترمہ عثمانہ اختر جمال نے ایک قلم بہ کف مجاہدہ کا کردار ادا کرتے ہوئے عملی زندگی میں۔ صدیوں سے ہمارے معاشرے میں خواتین کے ساتھ اہانت آمیز سلوک کیا جاتا رہا ہے۔ مصنفہ نے اپنی اس کتاب میں قارئین کو حریتِ ضمیر سے جینے اور حریتِ فکر و عمل کو زادِ راہ بنانے کا مشورہ دیا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ صرف غربت، افلاس اور بدقسمتی ہی خواتین کی الم ناک زندگی کا سبب نہیں بنتی۔ یہ انہونی بھی دیکھی گئی کہ قصر شاہی کا ماحول بھی بعض خواتین کو عبرت ناک انجام سے نہ بچا سکا۔ شاہ جہان کی ملکہ ارجمند بانو (ممتاز محل) جو تاج محل آگرہ میں ردائے خاک اوڑھ کر سو رہی ہے بادشاہ کے سترہویں بچے کو جنم دیتے وقت زچگی کے دوران میں لقمۂ اجل بن گئی۔ کاش بغداد میں ہارون الرشید عباسی نے اپنی بہن عباسہ اور دہلی میں اورنگ زیب نے اپنی بیٹی زیب النسا مخفی کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہوتا۔ ان خواتین کو قید تنہائی میں رکھ کر جس اذیت و عقوبت میں مبتلا رکھا گیا وہ جبر کی لرزہ خیز اور اعصاب شکن مثال ہے۔ حالات خواہ کچھ بھی ہوں اور ان کا جو بھی پس منظر ہو مجبور خواتین پر کوہِ ستم توڑنا سفاکی اور شقاوت کی انتہا ہے۔ لکھنؤ کے باشندے خوش قسمت ہیں کہ وہاں ہر دور میں خواتین کے احترام اور انسانیت کے وقار اور سربلندی کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت پروان چڑھتی رہی ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب جو خدمتِ خلق اور نیکی کے اوصاف سے مزین ہے پوری دنیا میں ارفع مقام حاصل کر چکی ہے۔ لکھنؤ میں طبقاتی کشمکش کا وجود نہیں بل کہ یہاں محمود و ایاز سب ایک ہی صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اس تہذیب میں جاہ و منصب اور دولت و جاگیر کی بنا پر کوئی درجہ بندی نہیں کی جاتی بل کہ یہاں شرافت، دیانت، خدمت اور خلوص و مروّت کی بنا پر عزت و احترام کی منزل تک رسائی ممکن ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب کی شہرت کا قصر عالی شان اُن شخصیات کی خدمات اور کشف و کمال کی اساس پر استوار ہے جنھوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں خونِ دِل سے اس گلشن کو سیراب کیا۔ لکھنؤ کے باشندے بیگم حضرت محل، غلام بینا شاہ بینا، گھمن پیر اور دادا میاں کا نام بہت احترام سے لیتے ہیں۔

لکھنؤ کی تہذیب نے نوآبادیاتی دور کی افراتفری اور انتشار سے بچتے ہوئے جس مربوط، منظم اور آزادانہ انداز میں صدیوں کا سفر طے کیا ہے وہ اقوامِ عالم کی توجہ کا مرکز بن چکا ہے۔ ایک غیر محسوس صورت میں اس خطے کی ارضی اور ثقافتی اقدار و روایات کی مہک اس میں شامل ہو گئی ہے جس کے بارے میں جان کر قریۂ جاں معطر ہو گیا ہے۔ جزئیات نگاری میں محترمہ عثمانہ اختر جمال کو کمال حاصل ہے وہ جس مقام یا شخصیت کا ذکر کرتی ہیں اُس کے بارے میں تمام تفصیلات بھی پیش کرتی ہیں۔ لکھنؤ کی خواتین کے ملبوسات وہاں کی ثقافت کے آئینہ دار ہیں۔ محترمہ عثمانہ اختر جمال نے شعوری کوشش سے ثقافتی پہلو کی جانب متوجہ کیا ہے۔ بہرائچ سے آنے والی ضعیف بھکارن کے لباس کی صورت جیسے انھوں نے دیکھی اُسی طرح لکھ دی:

''اُن کا دوپٹہ، جمپر اور غرارہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔'' (عثمانہ اختر جمال: لکھنؤ کی تہذیب، صفحہ 32)

محترمہ عثمانہ اختر جمال ایک وسیع المطالعہ ادیبہ ہیں اُن کی تحریروں کو پوری دنیا کی ویب سائٹس پر پذیرائی ملی ہے۔ مجھے اپنی اس محرومی کا اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ میں اُن کی عظیم شخصیت اور علمی و ادبی پس منظر کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تاہم اُن کی تخلیقی تحریروں کو میں نے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اُردو ادب میں تانیثیت کے حوالے سے اُن کی علمی، ادبی اور معاشرتی خدمات تاریخ کے اوراق میں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔

اٹھارہ نومبر 2022ء کی شام مجھے محترمہ عثمانہ اختر جمال کی طرف سے ایک ای میل موصول ہوئی جس میں انھوں نے اپنی تصنیف بھجوانے کے لیے مجھ سے ڈاک کا پتا طلب کیا تھا۔ میں نے اپنے گھر اور ڈاک کا پتا بیس نومبر 2022ء کو ای میل کے ذریعے بھیج دیا۔ چار دسمبر 2022ء کو ایک رجسٹرڈ پارسل کے ذریعے مجھے فضلی بک کراچی کی طرف سے محترمہ عثمانہ اختر جمال کی تصنیف ''لکھنؤ کی تہذیب'' موصول ہوئی۔ محترمہ عثمانہ اختر جمال نے اپنی اہم تصنیف سے مجھے ارسال فرما کر مجھے خود اپنی نظروں میں معزز و مفتخر کر دیا ہے۔ میں ان کے اس کرم کے لیے سپاس گزار ہوں۔ یہی تو لکھنوی تہذیب کا ایک انداز ہے جس کا پوری دنیا میں چرچا ہے۔ لکھنؤ، جھنگ، امریکہ اور کراچی کا یہ معتبر ربط اقلیم معرفت سے تعلق رکھنے والی شخصیت کا ایسا حیران کن کرشمہ ہے جسے دیکھ کر فرطِ تشکر سے آنکھیں بھیگ بھیگ گئیں۔ ناخن پہ گرہ نیم باز کا جو قرض ہے وہ اس تحریر کے ذریعے اُتارنے کی سعی کی گئی ہے۔